

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ماضی قریب کے نامور عالم، مترجم و محقق تھے۔ مولانا نے اپنا یہ فاضلانہ مقالہ 30 ستمبر 1969ء کو راولپنڈی کے ایک اجتماع "شام ہمدرد" میں پڑھا تھا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف قیمتی مندرجات پر مشتمل ہے بلکہ مستشرقین کی فکری اساس اور ذہنی نفسیات کو سمجھنے کے لیے بھی انتہائی مدد و معاون ہے۔ بعد ازاں یہ مقالہ "مکتبہ ملی کراچی" سے طباعت پذیر ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے "الواقعة" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

یہ عالم حوادث و واقعات سے پُر ہے۔ ہر صبح کچھ نہ کچھ حادثات اپنے ساتھ لاتی ہے اور ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ان ہی حوادث و واقعات کی ترتیب، ان کے اسباب و علل کی تلاش اور ان کے اثرات و نتائج کی نشاندہی کو تاریخ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علم تاریخ نام ہے فطرت کے قوانین تکوین یعنی سنۃ اللہ فی الارض کی شناخت اور اس کے بیان کا۔ ایک مورخ یہ بیان کرتا ہے کہ کونسا واقعہ پیش آیا۔ کب اور کہاں پیش آیا۔ اس کے اسباب کیا تھے اور اس کے اثرات و نتائج کیا پیدا ہوئے۔

اس طرح جب ہم ماضی پر غور کرتے ہیں تو حسب ذیل سوالات ذہن میں خود بخود ابھرتے ہیں:

- 1- کیا یہ واقعہ پیش آیا؟ اس سلسلے میں بیان کرنے والے کا ذریعہ علم، اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے متعلق معلومات۔ واقعہ کے امکان عقلی و امکان عادی کے متعلق تحقیق و تدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ واقعہ کا ظرف مکان اور ظرف زمان متعین کرنے کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ تحقیقات کے بغیر یہ یقین نہیں پیدا ہو سکتا کہ واقعہ فی الحقیقہ ہوا بھی یا نہیں۔
- 2- اس کے بعد یہ مرحلہ پیش آتا ہے کہ واقعہ کے اسباب کیا تھے اور اس کے اثرات کیا مرتب ہوئے۔ اس کی تلاش و تحقیق ایک بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اگر کوئی محقق اس مرحلہ پر گھبرا کر سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تاریخ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

ان دونوں قسموں کے سوالات کو حل کرنے کے بعد ہی کوئی بیان، تاریخ کا بیان ہو سکتا ہے ورنہ محض افسانہ بلکہ مجلسی لطیفے سے زیادہ اس بیان کی علمی قیمت نہیں قرار پاسکتی۔ مثلاً ایک مستشرق نزول وحی کے دن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ام المومنین بی بی خدیجہ کے مابین اس خلوت کی گفتگو کو نقل کرتا ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المومنین کے سوا تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور حوالہ میں یہ لکھ دیتا ہے کہ "محمد بن اسحاق التوفی سنہ ۱۵۱ھ نے یہ گفتگو اپنی کتاب میں لکھی ہے۔"

اس گفتگو کی صحت تسلیم کرنے کے سلسلہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں:

- 1- کیا خلوت میں کوئی تیسرا شخص موجود تھا؟ روایت کسی تیسرے شخص کی موجودگی سے قطعی انکار کرتی ہے۔
  - 2- کیا یہ واقعہ حضرت ام المومنین نے کسی سے بیان کیا؟ حضرت ام المومنین سے کوئی روایت موجود نہیں ہے۔
  - 3- کیا یہ واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی صحابی سے بیان کیا؟ کوئی صحابی یہ نہیں بیان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے یہ واقعہ بیان فرمایا۔
- ظاہر ہے اب سارا دار و مدار محمد بن اسحاق اور اس کے شیوخ پر رہ گیا۔ عملاً یہ ممکن نہیں کہ خلوت میں اس وقت کوئی شخص موجود ہو، پھر علم رجال یہ بھی وضاحت کے ساتھ ہمیں بتا دیتا ہے کہ محمد بن اسحاق اور اس کے اکثر شیوخ غیر محتاط قصہ گو اور کہانیاں بنانے والے تھے۔
- امام ذہبی نے میزان الاعتدال ص ۲۲ ج ۳ طبع القاہرہ ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے:

"قال یحیی القطان اشہد ان محمد بن اسحاق کذاب قال ابن معین وهو صالح الحدیث مالہ عندی ذنب الاما قد حشانی السیرۃ من الاشیاء المنکرۃ المنقطعة والاشعار المکذوبۃ۔ قال مالک انظر والی رجال من الدجالة دخل رجل معہ حمل فوضعه فی عنق ابن اسحاق فاخرجه نڈھب الی السلطان فجلد۔ قال سعید من اجل القدس۔"

ذرا غور فرمائیے۔ واقعہ کا ظرف زمان و ظرف مکان خلوت میں کسی راوی کے وجود کو عادتاً ناممکن قرار دیتا ہے خود راوی غیر ثقہ، قصہ گو اور بے اعتبار اور بیان واقعہ "لفظ بہ لفظ" اس واقعہ کی تاریخی صحت کیا قرار دی جائے؟

اس جگہ ایک کم نظر کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ایسی گفتگو ہونا امکان عقلی و عادی کے حدود میں تو آتا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ایسی گفتگو ہوتی ہو۔ لیکن ذرا غور فرمائیے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ غلط فہمی ہے اور فکر کی کمزوری سے پیدا ہوئی ہے۔ کسی حادثہ کا صرف ممکن ہونا۔ اس کے حقیقہ واقعہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی شخص یہ بیان کرے کہ جس جگہ آج راولپنڈی کا ریلوے اسٹیشن ہے وہاں

اس سے پہلے ایک مندر تھا۔ اسے توڑ کر انگریزوں نے ریل کا اسٹیشن بنادیا تو اگرچہ اس کا امکان عقلی و امکان عادی موجود ہے لیکن جب تک اس کی کوئی شہادت نہ مل جائے صرف امکان کی وجہ سے اسے واقعہ تاریخی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر ایسا ہو کرے کہ صرف امکان واقف کو دلیل واقعہ قرار دے دیا جائے تو ہر ناول و افسانہ تاریخ کا مرتبہ پا جائے گا اور تحقیق کا سارا دفتر خرافات کا پلندہ بن جائے گا۔ شہادت ملنے کے بعد بھی ایک مرحلہ شہادت کی قیمت مقرر کرنے کا باقی رہ جاتا ہے۔ ہر بیان، تاریخی قیمت نہیں رکھتا اور نہ ہر شہادت قابل اعتماد ہوتی ہے۔

ایک اور مثال تاریخی تنقیح سے غفلت کی سن لیجئے۔ اس کے بعد اصل، موضوع پر جو ایک مختصر سی گفتگو ہے اس کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ مرحوم ڈاکٹر حسن ابرہیم حسن نے جو مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور آکسفورڈ Oxford کے سند یافتہ ڈاکٹر تھے۔ اپنے ماہر فن اساتذہ کے حوالہ سے کتاب "مشاہیر اسلام" (ص 24) میں یہ لکھا ہے کہ "حضرت عثمان ذی النورین نے حضرت ابو بکر صدیق کے سمجھانے سے اسلام قبول کیا اور اس وقت حضرت عثمان کی عمر 20 سال سے زیادہ نہ تھی۔" اسی کتاب کے صفحہ 23 پر وہ لکھ چکے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے پانچ یا چھ سال بعد حضرت عثمان پیدا ہوئے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال یا اس سے کسی قدر زائد تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس حساب سے حضرت عثمان کا سن 35 یا 34 سال ہونا چاہیئے۔ بیس سال کیسے ہو گا؟

اسی کتاب کے صفحہ 280 پر ہے کہ "حضرت عبداللہ بن زبیر کی عمر جب 17 سترہ برس کی ہوئی تو ان کے والد بزرگوار ان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔"

حضرت عبداللہ بن زبیر سن 1 ہجری میں بمقام قبایہ پیدا ہوئے یہ خود اس کتاب کے صفحہ (278) پر موجود ہے اور سارے مورخین کے نزدیک مسلم ہے۔ حساب کر کے دیکھئے کہ عبداللہ بن زبیر کی عمر کا گیارہواں سال شروع ہی ہوا تھا یا شاید دو دن ابھی دس سال کے پورے ہوئے ہیں باقی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے۔ یہ کہاں ممکن ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے 17 سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ہو۔

روایات تاریخی تنقیح اور اشخاص و اوقات کی تعین میں غفلت نے کیسی مضحکہ خیز غلطیاں سرزد کرائیں۔ ان دونوں روایتوں میں فاضل مورخ نے ایک عثمان کو دوسرے عثمان سے اور ایک عبداللہ بن زبیر کو دوسرے عبداللہ بن زبیر سے خلط ملط کر کے ناممکن کو ممکن بنادیا۔ شاید فاضل مصنف اور ان کے نامور اساتذہ نے علم الرجال کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس طرح کی غلطی سرزد نہ ہوتی۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں آپ تلاش کریں تو اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناقص مطالعہ کو کافی سمجھ کر لکھنے اور روایات کی تنقیح و تحقیق کے بغیر اس کو نقل کر دینے سے کیسی عجیب و غریب قسم کی غلطیاں بڑے بڑے نامور حضرات سے بھی ہو جاتی ہیں۔

خدا نخواستہ یہ مقصود نہیں ہے کہ کسی کے علم کی تقلیل یا اس کے کارناموں کی توہین کر کے اپنی بڑائی ثابت کی جائے مقصود صرف یہ ہے کہ میرا کسی شخص کا بیان بغیر ضروری تنقیح کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ یہ لازم ہے کہ اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے۔ اور یہ تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے جو اقتضائے بشری یا ناقص مطالعہ سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محقق کی نیت کا کھوٹ اور مقصد کی قباحت بھی تحقیق و تحریر کے ساتھ مل جائے تو پھر اس کے کرشمے بہت عجیب اور حد درجہ گمراہ کن ہوتے ہیں اگر مقصد ہی یہ ہو کہ کسی مذہب کو یا کسی قوم کو حقیر اور ناقابل نفرت ثابت کیا جائے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

علامہ بروکلمان (Karl Brockelmann) مشہور جرمن مستشرق ہماری صدی کے سب سے بڑے مستشرق اور بلاشبہ عربی ادبیات کے بے مثال عالم ہیں انہوں نے عربی کتابوں کی ایک ایسی جامع اور معلومات افزا فہرست تیار کی ہے کہ دوسری کوئی کتاب اس موضوع پر اس کے مقابلہ میں نہیں پیش کی جاسکتی۔ ابن الندیم کی "الفہرست"، مصطفی طاش کبری زادہ کی "مفتاح السعادة"، حاشیہ علیہ کی "كشف الظنون"، اسماعیل پاشا کی "ایضاح المکنون" اور "هدیۃ العارفین" اور یوسف الیان سرکیس کی "معجم المطبوعات" سے بھی علامہ بروکلمان کی تاریخ ادبیات عرب کا مرتبہ بعض اعتبار سے بلند ہے۔ آج کسی ایسے کتب خانہ مشرقیات کا تصور بھی ممکن نہیں جس میں علامہ بروکلمان کی یہ بے بہا کتاب موجود نہ ہو۔

لیکن یہی علامہ بروکلمان جب ایک عیسائی بن کر اور یورپین اقوام کو ترجیحی مزایا و مناقب کے جذبات کو اپنے سینے میں لے کر تاریخ مسلمانان عالم لکھتے ہیں تو ایسی بے سروپا باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ بہت سی مملکتوں کو ان کی کتاب کا داخلہ اپنے ممالک میں بند کر دینا پڑا۔ چنانچہ پاکستان میں بھی اس کتاب کا داخلہ بند ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی کتابوں کا یہ عظیم المرتبت کتاب شناس، کتابوں کا نام بتاتا ہے۔ مصنف کا نام اور اس کا سن وفات بتاتا ہے، کتاب کس کس کتب خانہ میں اور کہاں کہاں موجود ہے یہ بھی بتا دیتا ہے کبھی کتابوں کو کھول کر پڑھتا کیوں نہیں۔ اول تو کتابیں پڑھیں بہت تھوڑی، جو پڑھیں ان کی روایات پر غور نہیں کیا، پھر اسباب و نتائج ایسے پیدا کر لیے کہ کسی شخص کے حاشیہ خیال میں ایسے عجیب و غریب اسباب و نتائج نہیں آسکتے آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ تاریخ لکھتے ہوئے ان کا ذہن ایک متعصب کا ذہن تھا اور ان کے قلب و دماغ پر یورپین اقوام کی برتری کے تصورات کا قبضہ تھا۔

میں اس جگہ کچھ اقتباسات اس کتاب سے پیش کرتا۔ لیکن چونکہ اس کا اقتباس کرنا بھی قانوناً ممنوع ہے اس لیے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ پوری کتاب دور دراز کا قیاسات اور بے سروپا باتوں سے بھری پڑی ہے۔

### استشرق کی ابتدا

یہودیوں اور عیسائیوں کا واسطہ مسلمانوں سے بالکل ابتدائی دور میں ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے کئی دور ہی میں یہودی اور عیسائی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتداء کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں قریش کے بت پرستوں کے ہمنوا تھے۔ مدینہ منورہ کے دہ سالہ دور میں یہ مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ خصوصاً یہودیوں کی مخالفت اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قرآن حکیم کے وحی الہی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات ان کی طرف سے ہوتے رہے قرآن مجید کی کمی اور مدنی آیتوں میں ان کے بعض اعتراضات اور جوابات کا ذکر موجود ہے، ان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدیقی و فاروقی میں ان لوگوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ واسطہ پڑا اور عراق و شام کی فتوحات نے تو آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کی راہیں پوری طرح کھول دیں۔ عیسائی علماء مذہب نے اس زمانہ سے بطور مہم کے اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنے اور قرآن مجید اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی ابتداء کر دی تھی۔ مگر اس زمانہ میں ان کی طرف سے خود عیسائی بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکومت کی سخت گیری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی رواداری اور آزادی نے مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم آبادی کے لیے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ لوگ مسلمان فاتحین کی آمد کو خدا کی رحمت سے تعبیر کرتے تھے اور اپنے متعصب مذہبی پیشوائوں کی طرف لوگ کم ہی توجہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ مصر و شام کے عیسائی اور یہودی علماء اور پیشوایان مذہب اس کے مقابلہ میں بے دست و پا سے ہو گئے تھے۔

ولید بن عبد الملک (86-96ھ) کے دور میں کاشغر، بخارا اور سندھ فتح ہو گیا اور اس زمانہ میں اندلس بھی ممالک اسلامیہ میں شامل ہوا۔ اب اہل یورپ سے مسلمانوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا اگرچہ اس سے پہلے بھی یورپ کے زائرین بڑی تعداد میں بیت المقدس میں کنسید قیامت اور ولادت گاہ مسیح کی زیارت کے لیے جاتے تھے بلکہ بہت سے یورپین طلباء بیت المقدس اور دمشق میں رہ کر علم حاصل کرتے تھے مگر ان کا تعلق اتنا گہرا اور ایسا دوامی نہ ہوتا تھا جیسا کہ اندلس کی فتح کے بعد سے ہو گیا۔

تفصیلات کے بیان کا یہ موقع نہیں، عرض یہ ہے کہ یورپ کے طالبان علم کا تعلق اور عیسائی و یہودی پیشوایان مذہب کی اسلام کے خلاف علم فلسفہ اور تحقیقات کے نام سے مساعی بالکل ابتدائی دور اسلامی ہی سے جاری تھیں اور آج تک جاری ہیں۔ اس لیے ہم تاریخ کے کسی خاص وقت کو اس جدوجہد کا نقطہ آغاز قرار نہیں دے سکتے۔ البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے طریقے بدلتے رہے۔ مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن کلیسا کا زور ٹوٹنے کے بعد سے کچھ ایسے مستشرقین ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے جرات کے ساتھ اپنے ہی اساتذہ کی پھیلائی ہوئی بہت سی باتوں کو غلط قرار دیا اور پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس تردید سے ان کا مقصد سچ کو سچ کر کے دکھانا تھا یا خود اپنی طرف سے پیدا کیے ہوئے شکوک کو قابل معنی قرار دینا تھا۔ اس لیے کہ ان کی تردید کرنے والوں میں سے اکثر نے جہاں اپنے پیش رو مستشرقین کے کذب و افتراء کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی ہے وہاں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیے ہیں اور اتنی معصومیت کے ساتھ دبی زبان میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہہ گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کی نیت پر کوئی شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مثلاً لندن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر علامہ ڈنٹس سوراپنی کتاب "تاریخ الادیان" میں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بے سروپا اعتراضات اور اپنے ماقبل کے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی جھوٹی باتوں کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتے ہیں یہ کتاب 1933ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے وہ اپنے بیان میں اس قدر غیر متعصب اور بے لاگ مصنف نظر آتے ہیں کہ کسی کو ان کی نیت پر شبہ کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی بلکہ وہ اچھے خاصے عقیدت مند کی طرح بیان کرتے ہیں کہ

"مذہب کے عظیم بانیوں میں سے شاید محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی شخص ہیں جن کی شخصیت سے تاریخی حیثیت سے بالکل واضح ہے اور خرافات نے ان کی شخصیت پر کوئی پردہ خفا نہیں ڈالا ہے۔"

اور اس کے بعد عقیدہ تمندانہ انداز میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارناموں کی تعریف کرتے ہیں بلکہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ

"بلاشبہ عرب کے لوگ جنوں اور روحوں کی پوجا کرتے تھے اور روحوں کے جبری مجسموں میں جاگزیں ہونے کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ بت بھی ہوتے تھے۔ اسلام نے ان سب بتوں کو نیست نابود کر دیا۔ صرف ایک حجر اسود کو باقی رکھا شاید اس لیے کہ اس سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا احترام مقصود تھا یا شاید یہ ایک سیاسی عمل تھا جس کے ذریعہ عربوں کے باہمی اتفاق کو باقی رکھنا مقصود رہا ہو۔ (ص 221 المشرقون والاسلام مصنفہ زکریا ہاشم زکریا۔ طبع القاہرہ 1965ء)

آپ نے دیکھا کہ فاضل پروفیسر نے کس معصومیت کے ساتھ یہ یقین دلانے کی سعی فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیاسی مصلحت کی بناء پر ایک بت کو باقی رکھا اور اس حد تک بت پرستی کو اسلام میں جائز قرار دیا حالانکہ زمانہ جاہلیت میں بھی جبکہ سینکڑوں بت تھے کبھی حجر اسود کو بتوں کے زمرہ میں نہیں شمار کیا گیا اور نہ کبھی اس کی پوجا کی گئی۔ حجر اسود کا ذکر ہی کیا۔ اٹھارہویں صدی تک یورپ کے مستشرق اور محققین یہ لکھتے رہے اور مشہور کرتے رہے کہ مسلمان جو حج کو جاتے ہیں وہ اس لیے جاتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ایک برنجی بت بنوا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان اس بت کو سجدہ کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں خود علمائے یورپ نے اس کی تردید کی اور ایک بار نہیں بار مختلف ممالک کے علماء نے اس کی تردید کی۔ تب یہ خیال لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکا یا شاید اب بھی دور افتادہ دیہاتیوں میں یہ خیال موجود ہو۔

بہر حال جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی گئی۔ عربی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی رہیں اور یہ انتہائی حق ناشناسی ہو گئی کہ عربی کتب کے اصل مضمون کی تصحیح و اشاعت اور ان میں سے بہت سی کتابوں کے یورپین زبانوں میں ترجمہ کرنے کی جو عظیم الشان خدمت پچھلے پانچ سو سال کے اندر یورپ کے مستشرقین نے انجام دی ہے اس سے انکار کیا جائے یا ان کو کمتر درجہ کا کارنامہ قرار دیا جائے۔ اس کے لیے سینکڑوں مستشرقین نے اپنی عمریں صرف کر دیں حکومتوں اور بادشاہوں نے لاکھوں روپے خرچ کیے دولت مندوں نے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے اور آج عربی کی بڑی بڑی اہم کتابیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے بہت سی کتابیں وہی ہیں جو ان ہی مستشرقین کی مساعی جیلہ سے پہلی بار طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آسکیں ہیں۔ اس طرح افتراء پر دازی کا وہ بادل بھی آہستہ آہستہ چھٹ رہا ہے جو صدیوں تک قدیم مستشرقین اور پیشوایان مذاہب کے بیانات اور ان کی تحریروں سے یورپین ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اب تحریروں کے انداز اور مستشرقین کے تحقیقات اسلامی کا طریقہ کسی نہ کسی قدر بدلا ہوا نظر آتا ہے، اگرچہ اب بھی مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لگائی دیتی ہے۔ پادری زویر کی تحقیقات اسلامی اور ڈاکٹر کنیٹیل اسمتھ کی تحقیقات میں مقاصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ملتا۔ دونوں کی تحقیقات کو دیکھ لیجئے۔ مقصد وہی استعماریت کی تائید اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی سعی ہے۔

### چار ادوار

مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولت مطالعہ کے لیے چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

- 1- پہلا دور ابتدائے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لے کر پندرہویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک۔
- 2- دواہم دور پندرہویں صدی کی ابتداء سے اٹھارہویں صدی کے اختتام تک۔
- 3- تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتداء سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی 1925ء تک۔
- 4- چوتھا دور 1926ء سے آج تک۔

(1) دور اول میں یورپ کی حیثیت شاگردوں کی سی ہے اور مسلمانوں کی حیثیت استادوں کی سی۔ یہ دور تقریباً آٹھ سو سال کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں مسلمان اندلس میں، صقلیہ میں اور جنوبی ایتالیا میں حاکمیت و حیثیت رکھتے تھے ان کے بڑے بڑے علماء اور فلسفی ان علاقوں میں موجود تھے۔ اس وقت علم اور تمدن کے ممالک مسلمان تھے۔ ان ہی کی تہذیب، تہذیب تھی اور ان ہی کے علوم، علم شمار کیے جاتے تھے۔

اس دور میں عیسائیوں اور خصوصاً یورپ کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ تھا۔ پاپائے اعظم اور ان کے نائبین مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے اور عربی کتب و رسائل جمع کرتے تھے اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دور کے آخری حصہ میں کیا گیا۔ طب، فلسفہ، فلکیات، زراعت اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا۔ ابن رشد اور جابر بن اسحاق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ یہ کام عموماً ایتالیا میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا لیکن نیابت و دانائی کے ساتھ، فارابی کو ”فارلس“، ابن رشد کو ”اپوی روس“، جابر کو ”جیر“ اور ابن سینا کو ”اوی سینا“ بنا دیا گیا۔ اور طلباء کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا، کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ اگرچہ یہ راز زمانہ مابعد میں راز نہ رہ سکا لیکن یورپ کے کچھ نہ کچھ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یورپین تھے اور مذہباً عیسائی تھے۔

اس دور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب بیہت ناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلانے گئے۔ کچھ مسلمانوں کی سفاکی کے قصے اور کچھ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بے سرو پا افسانے خوب خوب گھڑے گئے اور اسی زمانہ میں یورپ والوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔

اس زمانہ کے اجلائے مستشرقین میں سب سے اول نام ”جو بروی اور لیک“ ایک فرانسیسی راہب کا ملتا ہے۔ یہ فرانس میں 938ء میں پیدا ہوا اور 1003ء میں بمقام وٹیکن وفات پائی۔ اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آکر فرانس و ایتالیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ واپسی پر وہ ایتالیا میں مستقل اقامت گزیر رہا حتیٰ کہ 999ء میں وہ بابائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر منتخب ہو گیا۔ اس نے دو عربی مدرسے بھی قائم کیے اور فلکیات و ریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی کیے۔ اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ 1899ء میں برلن سے شائع ہوا ہے۔ (نجیب الحقیقی۔ المستشرقون: ج 1 ص 120 طبع مصر 1964ء)

اس دور کے مستشرقین ”اور لیک“ کے علاوہ قسطنطین الافریقی التونی 1078ء، اوجودی سانتا، ڈی کویل، ایڈیلارڈ، پطرس، یوحنا رابرٹ، ہرمان، ڈنیل مورلے، میکس لیکٹ، لیونارڈ، تھامس ڈی اکوین، روجر بیکن اور ریڈ لیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ یہ سب اندلس، صقلیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور بہت سی علمی کتابوں کے فرنچ اور لاطینی میں ترجمے کیے ہیں۔ تقریباً یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں۔

اسی دور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا بھی ہے جس نے ایتالیا میں تعلیم حاصل کی۔ بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا۔ اس کے بعد تونس چلا گیا۔ وہاں صدق دل سے مسلمان ہو گیا اور عبد اللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہیں تقریباً اسی سال کی عمر میں 1432ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر تونس میں باب المنارہ میں ہے۔ (حوالہ سابق ص 132)



شیخ عبداللہ تو رمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنج مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پالیا اور مسلمان ہو گئے ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنجی میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے خدا جانے کہیں یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضائع کر دیئے گئے۔

(2) دوسرا دور جو یورپ کی بیداری پندہوریں صدی مسیحی سے اٹھارہویں صدی کے ختم تک تقریباً (400) سو سال پر مشتمل ہے دولت عثمانیہ ترکیہ کی اقبال مندی کا زمانہ ہے 1453ء میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور بہت سے ممالک یورپ عثمانیوں کے زیر نگین آ گئے۔ دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہر طرح کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں اور ان کا لب و لہجہ بھی اسلام کے خلاف بہت تلخ ہو جاتا ہے۔ یہ تلخی عثمانی فتوحات کے خلاف جذبات نفرت کی پیداوار ہے اس دور میں ان کارنامے یہ ہیں کہ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شائع کیا۔ ان کے ترجمے کیے اور اس کے لیے بادشاہوں نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے عالموں نے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ ان کارناموں کے علاوہ خود یورپین زبانوں میں اسلام پر اس دور میں بکثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بکثرت اشاعت کو آسان کر دیا۔

اس دور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سر زمین ایشیا و افریقہ پر قبضہ جمایا۔ مستعمرات اور یورپین مقبوضات کا یہی زمانہ ہے۔ انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان، صومالیہ اور جنوبی و مغربی و مشرقی افریقہ پر نیدر لینڈ، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اطالیہ کے تسلط کی ابتداء اس دور میں ہوئی۔ جن علاقوں پر ان استعمار پسندوں نے قبضہ کیا تھا ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی بڑی ہی نہیں بلکہ اکثریت کی آبادیاں تھیں۔ قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں ان کے عقائد و روایات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے۔ ان میں مذہبی تعسف کو گہرائی دے کر ان کے لیے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے۔ ان کے ایمان و عقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جائے۔

ان مقاصد کے لیے یورپین ممالک خصوصاً فرانس و جرمنی نے بڑی جدوجہد کی۔ اس وقت ان کے سامنے اہم ترین مسئلہ ایک یہ بھی تھا کہ دولت عثمانیہ کی قوت کو کسی طرح توڑا جائے اس کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے اور نہ صرف پیدا کر دی جائے بلکہ اس منافرت کو دوامی صورت دیدی جائے، اس مقصد کے لیے فرانس کے بادشاہ لوئیس 14 نے بے دریغ دولت صرف کر دی مستشرقین نے مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے۔

اس زمانہ کے مستشرقین کا بہت بڑا طبقہ یہ باور کرانے کی دھن میں لگا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام سے پہلے ہی عرب بڑی عظمت و شان کے مالک تھے۔ اسلامی تاریخ عربوں کے مجدد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے۔ اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی۔ عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا لیکن اس دور کی آخری دو صدیوں میں عربوں کو ترکوں کے خلاف تیار کرنے کی منظم جدوجہد یورپین حکومتوں نے مستشرقین کے ذریعہ شروع کی۔ عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتداء ہوئی آثار قدیمہ نکالے جانے لگے اور عربوں کو وطن قومیت کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ جس کا نتیجہ تقریباً سو سال کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اس دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت کا کام اطالیہ اور فرانس تک محدود نہ رہا بلکہ ان ہی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذریعہ یورپ کے دوسرے ممالک تک پھیل گیا۔ خصوصاً جرمنی اور نیدر لینڈ میں مطابع قائم ہوئے اور لوگ اس سلسلہ میں کام کرنے لگے۔ آخر میں انگلستان میں تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہو گئے۔

اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اولین نام مسٹر جی پو شل کا آتا ہے یہ نار منڈی کے ایک قصبہ باونٹوں میں 1505ء میں پیدا ہوئے اور 1581ء میں وفات پائی۔ ان کو بادشاہ وقت نے جاگیر بھی دی تھیں۔ انہوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کیے بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور عربی و عبرانی زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں

لکھیں۔ یہ ایک مذہبی پیشوا تھے اور مذہب عیسوی میں بعض باتیں پیدا کرنے کے جرم میں حکومت فرانس نے انہیں قید کر دیا تھا۔ ان کی وفات بھی قید خانہ میں ہوئی۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں بی ویٹیر (1213-1367)، بی ڈی بریلو (1625-1695)، انطون گالان (1646-1815)، پادری ریٹا ورڈو (1647-1720) اور پادری بارتیلی (1716-1795) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور اس دور کے آخر میں کچھ ایسے مستشرقین بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے پیشتر و مستشرقین کی تردید کی۔ ساتھ ہی کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیے۔

(3) تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتداء سے 1925ء تک ہے۔ اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ پیدا ہوا۔ یورپ کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں عربی اور اسلام کے مطالعہ کے لیے خاص شعبے قائم ہوئے۔ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت پیدا کرنے کی مہم بہت تیز کر دی گئی۔ اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں اسلامی تحقیقات کے نام سے مسلمانوں کے اندرونی اختلافات اور جدید فرق اسلامیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں۔ تقریباً ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں۔

اس دور کے مستشرقین عربی متون کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و جغرافیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لیے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ (اول) عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لیے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں کے الزامات کا التزام اور (دوم) مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی۔ اس دور میں قرآن مجید کے متعدد تراجم ہوئے قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن بکثرت تیار کیے گئے۔ مسٹر جی فلوگل (1802-1870) اور مسٹر ہملٹین التونی 1824ء مترجم ہدایہ اسی دور کے علماء ہیں۔

اس دور کے مشہور مستشرقین میں سے ایڈورڈ ریہاسنک (1819-1891)، مسٹر ہیوز مصنف "تاریخ اسلام"، تھامس کارلائل، ولیم ہوک مارلے، ایڈورڈ مہلر، ایل اسمٹ، پادری ڈروم، سی ای ولسن، گولڈ زیہر، پادری کموشکو، جان جاک سدو، لیونے کا تانی، پادری فاکاری، لازینی، بلا شیر اور نالیو وغیرہم ہیں۔ مشہور پروفیسر پامر اور ان کے نامی گرامی شاگرد کرنل لارنس آف عربیا اسی دور کے بزرگ ہیں۔

(4) چوتھا دور جو 1926ء میں امیر کاتینی کی وفات سے اب تک ہے۔

اس دور میں تحقیقات اسلامی کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نو لدیکے اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخاؤ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح تھامس آرنلڈ، مسٹر جیکسن، مونٹ گری واٹ، پروفیسر گویم، لی اسٹونج، مسٹر لیمب، مسٹر انڈوسن، پروفیسر مارگو لیتھ، ڈینی راس، مسٹر اولیری، مسٹر لوکارٹ، مسٹر برائون، مسٹر ہملٹین گب، مسٹر لنڈاؤ اور مسٹر لولیس وغیرہم نے تحقیقات اسلامی کا کام کیا اور کر رہے ہیں پادری زویبر التونی 1952ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اس دور کے ہیں۔ جن کے متعلق خود مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ ان کے تعصب نے ان کی تصنیفات کا علمی مرتبہ ہی ختم کر دیا۔ اس دور میں تحقیقات اسلامی کا دائرہ فقہ، اصول فقہ تک وسیع ہو گیا۔ اسلامی فرقوں کے حالات اور ان کے افکار کی طرف توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ان موضوعات پر کچھ نہ کچھ کام مستشرقین نے کیا ہے۔ مگر اس عہد میں توجہ ان موضوعات اور تصوف اسلامی کی طرف زیادہ بڑھا دی گئی ہے۔

اس دور میں ایک بات یہ بھی پیدا ہو گئی کہ بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے اصول پر قائم ہوئیں۔ اس طرف توجہ 1925ء کے بعد سے ہوئی اور 1945ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پر و پیگندہ خود عیسائیت کے لیے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ اس لیے باسٹشنائے چند مستشرقین یورپ کا لب و لہجہ

اسلام کے خلاف یادہ گوئی میں نسبتاً نرم ہو گیا۔ اور اس وجہ سے مذاہب کی کافر نسوں، تقریروں، اور مقالات صلح و آشتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس صورتحال کا اثر سب پر نہیں پڑا۔ پادری سموئل زویمر اور ان کے ہموا پوری قوت کے ساتھ اسلام قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لکھتے رہے وہ اپنے لب و لہجہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے۔ مگر پھر بھی دیگر مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنی تحریروں کو مصلحتاً کسی قدر نرم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

#### مقاصد

کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر علت غائی یعنی مقصد عمل کے ممکن نہیں ہے اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل تحقیقات اسلامی کسی مقصد کے بغیر ہوتا رہا ہے یا ہو سکتا ہے یقیناً یہ ساری محنت اور حکومتوں اور اوقاف کی طرف سے اتنے بڑے پیمانہ پر کام بھی، کوئی مقصد رکھتا ہے اور یقیناً ان اعمال کا کوئی مقصد ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاش علم ہو سکتا ہے لیکن یہ خیال اس لیے محض باطل ہو جاتا ہے کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پُر جوش مبلغ ہیں اور آج تک اکثریت ان ہی مبلغین کی، اس کام میں مشغول نظر آتی ہے، جو دین مسیحی کے بہترین مبلغ ہیں۔ ذرا ان چند ناموں پر غور کیجئے یہ سب مسیحی پادری ہیں اور مدتوں تک مرتاض راہب رہ کر انہوں نے تربیت پائی ہے:

- پادری الیا نو التونی 1589ء
- پادری ریلو التونی 1848ء
- پادری مارٹن التونی 1880ء
- پادری بلن التونی 1891ء
- پادری ایوجی التونی 1895ء
- پادری کوش التونی 1895ء
- پادری تھی کوپر التونی 1904ء
- پادری جولیان التونی 1911ء
- پادری بروبر التونی 1919ء
- پادری میکارتھی المولود 1913ء
- پادری بولوموئے التونی 1929ء
- پادری زیوفین التونی 1928ء
- پادری ڈیورنڈ التونی 1928ء
- پادری مالون التونی 1938ء
- پادری لامنس التونی 1938ء
- پادری کولنگیٹ التونی 1938ء
- پادری لاپیرے التونی 1950ء
- پادری مونوڈے المولود 1880ء
- پادری ہنری چارلس المولود 1900ء
- پادری فلیش المولود 1904ء

یہ سب مبلغ (مشرقی) اور پادری ہیں اور کلیسا کے مذہبی عہدہ دار ہیں۔ انہیں بیش قرار تنخواہیں کلیسا اور اوقاف کلیسا سے ملتی رہی ہیں۔



ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدے دار کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کسی مقصد اور کسی جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے۔ اور یورپ کی استعماری حکومتوں نے ان پر جو کروڑوں روپے خرچ کیے یا کر رہی ہیں ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، نباتات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شاید یہ کہہ دیا جائے کہ محض تلاش علم کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں یا کرتے رہے ہیں لیکن ایسے حضرات بہت ہی کم ہیں اور ہمارے موضوع سخن سے اس مقالہ میں یہ لوگ خارج ہیں اسلامی عقائد، قرآن حکیم، اسلامی تاریخ، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے ان مسیحی خانقاہ نشینوں اور مبلغوں کا مقصد صرف تلاش علم و ہنر کیسے ہو سکتا ہے؟

مستشرقین کی اسلامی تحقیقات کا مقصد جو ان تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ، استعمار کے لیے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جدوجہد کے سونچے اور نظر نہیں آتا۔ اس مقصد کے لیے وہ بڑے خلوص اور تندہی سے کام کرتے ہیں تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور چونکہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں۔ اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مسلمان حکومتوں نے ہمیشہ سے آزادی رائے دی ہے۔ اس لیے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں نے طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں اور آج یہ تحریریں اسی طرح پیش کی جاتی ہیں۔ جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتاب ہو۔ اس کے علاوہ خود مسلمانوں میں کچھ لامذہب اور زندیق قسم کے افراد بھی داخل یا پیدا ہوتے رہتے ہیں، یہ لوگ ان کی تحریروں پر خاص توجہ کرتے ہیں مثلاً یسار بن بود، ابونواس جیسے مشاہیر فُسانی اور زناوتہ کی تحریریں ”کتاب الاغانی“، ”کتاب اخوان الصفا“، ابو نعیم کی ”کتاب الفتن“ اور اس قسم کی دوسری کتابوں سے مواد لیتے ہیں۔ بعض بالکل جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن ابن داود کی طرف منسوب کتاب ”المصنف“، زبیر بن بکار کی طرف منسوب ”کتاب نسب قریش“، ابو علی سینا کی طرف منسوب ”رسالہ حشر الاجساد“ وغیرہ ان کے مقاصد کے لیے بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متون کتاب کی طاعت و اشاعت میں انہوں نے جو کام کیا ہے۔ فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انہوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفریں ہیں ان کی محنت و مساعی سے بہت سی نایاب اور قیمتی کتابیں چھپ کر ہمارے لیے قابل حصول ہو گئیں۔ لیکن جہاں انہوں نے ترجمہ و تحشیہ کا کام کیا ہے یا کتاب لکھی ہے۔ وہاں کبھی بالارادہ اپنے جذبہ عداوت کے ماتحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے کتاب کو کیا سے کیا بنانے کے بھی رکھ دیا ہے اور عجیب عجیب گل کھلائے ہیں مثال کے لیے مشہور مستشرق فلوگل کو لیجئے انہوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ چھاپا الفاظ کی فہرست مرتب کی اور 1842ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا۔ اس لغت میں انہوں نے 39 الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دیئے اور نتیجتاً معانی بدل ڈالے مثال کے لیے ان پانچ الفاظ کو دیکھیے:

- (1) اثرن کا مادہ ”ا-ث-ر“ قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ”ث-و-ر“ ہے۔
- (2) النخاص کا مادہ ”خ-و-ص“ قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ”م-خ-ص“ ہے۔
- (3) استبقوا کا مادہ ”ب-ق-ی“ قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ”س-ب-ق“ ہے۔
- (4) وقرن کا مادہ ”ق-ر-ن“ قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ”ق-ر-ر“ ہے۔
- (5) مقیلا کا مادہ ”ق-و-ل“ قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ”ق-ی-ل“ ہے۔

اس تبدیلی سے معانی بالکل بدل گئے۔ یہ وہ مسٹر فلوگل ہیں جن کو مستشرقین کے نزدیک سند مستند کا مقام حاصل ہے۔

چونکہ ہمیشہ سے یہ اعتراض مسیحیت پر کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے وہ حضرت عیسیٰ کی غلط اور فرضی سوانح عمری ہے۔ اس میں عیسیٰ کی لفظ بھی وحی الہی کا نہیں ہے اور یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ دنیا میں کہیں وحی الہی کا ایک لفظ بھی بجز قرآن مجید کے موجود نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے اس کا کوئی جواب عیسائی مستشرقین کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے مستشرقین نے اپنی تحقیقات اسلامی کا سارا زور اس پر لگا دیا ہے کہ قرآن مجید بھی اصلی نہیں ہے اور قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے وہ عجیب

عجیب دلائل پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً علامہ گولڈ زیہر اپنی کتاب ”مذہب التفسیر الاسلامی“ میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ کی صحت بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ ابتدائے ابتدا سے لکھا گیا تھا تو حروف پر نقطے نہیں تھے۔ اس لیے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور پڑھا۔

ذرا غور فرمائیے اس فاضل مشرقین نے کیا بات پیدا کی ہے۔ جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاد سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعہ صوت آوار ہو اس میں نقطہ کی اہمیت کیا ہے۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اقدس سے آواز سنتے تھے یا لکھی ہوئی تحریروں سے قرآن مجید یاد کرتے تھے۔ اور آج تک کسی مسجد اور کسی مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آواز مد، سکون، وقف، سکتہ یہ سب کچھ بذریعہ روایت محفوظ ہے اس کے لیے حروف اور نقطہ کی ضرورت بھی کہاں پڑتی ہے؟

شاید علامہ گولڈ زیہر کا مقصد یہ ہے کہ جب وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے لکھوا کر اس لیے محفوظ فرما دیتے تھے کہ لوگ آکر مسجد میں رکھے ہوئے اس نوشتہ کو پڑھ لیا کریں اور آپ کسی کو زبان سے کچھ نہیں سنایا کرتے تھے۔

یہی ہو تا تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نا بینا صحابی نے قرآن مجید کیسے یاد کیا اور ناحرف شناس تو بہت سے حافظ قرآن صحابہ میں موجود تھے۔

اسی طرح کی مہمل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ حضرات مشرقین نے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات شریف اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اسی طرح سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی کبھی بالارادہ کو ششیں کرتے ہیں اور کبھی نقص مطالعہ اور غرورِ علم و فضل کی آمیزش سے ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں:

سنیئے ایک مبلغ اور مشرق ہیں ”لوئی وڈر مین“ انہوں نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر حضرت زبیر اکثر جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جایا کرتے تھے۔ ام المومنین ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خللا ملا جائز نہیں ہے۔

اس اعتراض کے بعد جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ حضرت زبیر کی حقیقی پھوپھی تھیں اور ان ہی نے بچپن سے ان کو پالا تھا کوئی غیر نہ تھیں ”تو نہایت معصومیت سے فرمایا اچھا یہی بات ہوگی۔“  
مثالوں سے بات بڑی طویل ہو جائے گی اس لیے اب میں اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ

(1) عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اس کا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام و عراق، مصر و مراکش وغیرہ میں کیوں قدم جما لیے اس کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا اور کام لے رہے ہیں اور ہمیشہ کام لیتے رہیں گے۔ مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شکایت کرنا بزدلی ہے اور چوکنا رہنا ہوشیاری و دانائی۔

(2) عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کسی مذہب کے مبلغ نہیں ہیں۔ کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہر اول دستہ تھے اور اب یورپین تہذیب و تمدن کے نقارچی ہیں جنہیں بیش قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے دی جاتی ہیں یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں اور کبھی کوئی اور روپ بھی دھار لیتے ہیں۔

(کلمہ حق مومن کا کھویا ہوا مال ہے۔ جہاں کہیں مل جائے مومن ہی اس کا زیادہ حق دار ہے)۔